طاری ہوتی کہ انسانی اختیار کا احساس بالکل محو ہو گیا اور وہ اپنے آپ کو کائنات کے بالمقابل بالکل عاجز اور بے بس سمجھنے لگے۔ اسی عاجزی اور بے بسی کے باعث اُنہوں نے معاشرتی سیاسی اور مادی زندگی کو تبدیل کرنے کی کوشش کو بھی بے سود خیال کیا اور نتیجۃً وہ اقوام مسلمانوں کے آگے بڑھ گئیں جن کو اپنی فعالیت کا یقین اور اپنے مختار ہونے کا احساس تھا۔

یہ اعتراض بہت سی تاریخی غلط فہمیوں پر مبنی ہے ورنہ جہاں تک نفسِ اسلام کا تعلق ہے اس پہ یہ اعتراض وارد نہیں ہو سکتا اس کے بے اصل ہونے کا سب سے بڑا ثبوت خود دَورِ رسالت اور خلافت راشدہ کی تاریخ ہے۔ جبکہ مسلمانوں کی فعالیت اور انقلاب پسندی نے ایک دُنیا کو زیر و زبر کر دیا تھا۔ اگر نبی کریم صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم کے پیرو اور خلفائے راشدین کے دست و بازو اپنے آپ کو اتنا بے بس اور بے اختیار سمجھتے تو وہ دنیا میں اتنا بڑا انقلاب کیسے پیدا کر سکتے، صدرِ اوّل کے مسلمانوں کی حرکت پذیری اور ان کا جوشِ عمل خود اس بات کی دلیل ہے کہ خدا کی قدرت کاملہ کے معنے ان کے ذہن میں یہ نہ تھے کہ انسان اپنی اخلاقی تمناؤں اور روحانی اُمنگوں کو عالمِ خارجی پر موثر نہیں کر سکتا۔ نہ ہی مسلمانوں کی ابتدائی تاریخ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ دُنیوی تدابیر سے غافل تھے اور قضا و قدر کا کوئی ایسا تصور رکھتے تھے جس کی رُو سے انسانی تدابیر کو بے اثر ماننا ضروری ہو۔ ان کی فوجی ملکی اور سیاسی تدابیر یقیناً ہم عصر قوموں سے فائق تھیں، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن اور رسول کی تعلیمات سے ابتدائی مسلمانوں میں جو تصورِ حیات پیدا ہوا تھا وہ بعد کے دینی اور اخلاقی تصورات سے مختلف تھا۔ ورنہ اگر انسان کے مقام اس کے اختیار اور فعالیت کے بارے میں ان کا نقطۂ نظر وہی ہوتا جو بعد کے مسلمانوں کا تھا تو اُن کی فتوحات اور دوسرے انقلاب آفرین کارناموں کا معرضِ وجود میں آنا ممکن نہ تھا۔

اس میں شک نہیں کہ بعد کی تاریخ میں مسلمانوں کا جذبہ عمل جبری تصورات کے باعث روز بروز مضمحل ہوتا گیا، اور انسان کے اختیار اور مرتبہ کا احساس رفتہ رفتہ زائل ہو گیا، لیکن یہ تبدیلی بعض سیاسی حالات کی بنا پر پیدا ہوتی اور اس کی ذمہ داری زیادہ تر اموی ملوکیت کے سر ہے یہ حقیقت ہے کہ بنو اُمیّہ کا اقتدار دینی اور اخلاقی قدروں پر قائم نہیں تھا اور اموی حکمرانوں کو اس امر کا شدید احساس تھا کہ ان کے عزائم طرزِ زندگی اور سیاسی طریق کار کو دینی اور مذہبی حلقوں میں اچھی نظر سے نہیں دیکھا جاتا، چونکہ وہ اسلامی اقدار اور نصب العینوں سے ہٹ گئے تھے۔ اس لئے اُن کی حکومت کا کوئی اخلاقی وقار باقی نہ تھا، محض فوجی طاقت اور قبیلوی عصبیت اُن کی پشت پناہ تھی۔ اس لئے یہ امر ناگزیر تھا کہ مسلمانوں کا اہلِ فکر طبقہ اُن کی بدکرداریوں پر چیں بجبیں ہو اور ان کے ظلم و جبر کو خدا کی جانب منسوب کرنے کے بجائے خود اُن کے اپنے اختیاری افعال کا نتیجہ قرار دے اس طرح اموی دَورِ حکومت میں یہ مسئلہ بڑی شدت سے اُبھرا کہ آیا انسان اپنے اعمال و کردار میں مختار ہے یا مجبور

اگر برائی گناہ اور ظلم انسانی اختیار سے پیدا ہوتا ہے تو انسان خود اس کا ذمہ دار اور جوابدہ ہے۔ اس نقطۂ نظر کا منطقی نتیجہ یہ ہوتا کہ اموی حکمرانوں کو ان کی بداعمالیوں کا ذمہ دار قرار دیا جاتا اور اس کی وجہ سے بنی امیہ کی حکومت کا رعب دلوں سے نکل جاتا۔ دوسرا نقطۂ نظر یہ ہو سکتا تھا کہ انسانی افعال کا خالق خدا ہے اور انسان محض ایک بے بس اور مجبور و مقہور ہستی ہے۔ جس کو خدا ایک بے جان مشین کی طرح چلاتا رہتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں انسان طاقتِ الٰہی کا بے اختیار آلۂ کار ہے۔ اس لئے اس کے افعال کی ذمہ داری اُن کے اپنے سر نہیں دنیا میں جو برائی یا ناانصافی ہوتی ہے خدا کی مرضی سے ہوتی ہے۔ اس لئے بنو امیہ کی بد افعالیوں اور مظالم کے لئے حکمران خاندان کو ذمہ دار نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔ اس نقطۂ نظر میں بنو امیہ کو اپنی سیاسی کامیابی نظر آئی اور انہوں نے اپنی حکومت کی ساری مشینری اس کی حوصلہ افزائی اور انسانی اختیار کے عقیدہ کو کمزور اور پامال کرنے میں لگا دی۔ اس طرح رفتہ رفتہ مسلمانوں پر جبری عقیدہ غالب آگیا اور ان میں یہ احساس جاتا رہا کہ انسان ایک فاعل و مختار ہستی ہے جو اپنی کوششوں سے واقعات و حالات کو بدل سکتا ہے بدقسمتی سے بنو عباس کے تحت ملوکیت کا شکنجہ کمزور ہونے کے بجائے اور زیادہ مضبوط ہو گیا اور ایران کی ملوکی روایات نے جمہوریت پسندی کو بالکل کمزور کر دیا۔ اموی حکومت میں تو عامۃ الناس پھر بھی اپنے حقوق کے لئے آواز بلند کر سکتے تھے، لیکن عباسیوں کی آمد کے ساتھ عجم کے سیاسی تصورات کا بھی غلبہ ہونے لگا اور جو کچھ رہی سہی جمہوریت مسلمانوں میں باقی رہی تھی وہ بھی ختم ہو گئی۔ نتیجۃً افراد میں اپنے مرتبۂ انسانیت اپنے اختیار اور فعالیت کا احساس بہت جلد زائل ہو گیا۔ ان پر جو سیاسی اور معاشی بے بسی طاری ہو گئی تھی وہ دینی تصورات میں بھی منعکس ہوتی گئی اس کے بعد سے مسلمان جبری تصورات سے کبھی چھٹکارا نہ حاصل کر سکے اور تقدیر کا ایک بالکل غلط تصور ان کے ذہن و دماغ پر چھا گیا۔ جس کے اثر سے ان کا جذبۂ عمل بالکل سرد پڑ گیا اور حرکت و تبدیلی کی خواہش بالکل فنا ہو گئی۔

مسلمانوں میں جبری تصورات صرف دینی اور سیاسی مسائل کی راہ سے نہیں آئے۔ ان تصورات کی تخلیق اور نفوذ میں تصوف کا بھی بڑا حصہ تھا۔ بالخصوص وحدت الوجودی نظریہ کا۔ وحدتِ وجود کو سرے سے ہستی انسان ہی سے انکار ہے لاموجود الا اللہ وہ کہتا ہے کہ اللہ کے سوا کسی کا وجود ہی نہیں، جب انسان کا وجود ہی باطل قرار دیا گیا تو اس کی فعالیت اور اختیار کا کیا سوال ہو سکتا ہے۔ بعض جگہ صریحاً انسانی وجود سے انکار کرنے کے بجائے انسان کے اختیار کی نفی کی گئی لاموثر فی الوجود الا اللہ یعنی انسان کا وجود ہو تو ہو لیکن موثر وجود نہیں۔ بالفاظ دیگر اثر اور فعل کے اعتبار سے انسان کا ہونا نہ ہونا برابر ہے۔ تغیراتِ عالم کے جو بھی عوامل ہوں انسان ان میں شامل نہیں۔ اس کو اپنے بناؤ اور بگاڑ پر کوئی قدرت نہیں۔ اس کے اعمال و افعال

کچھ بھی ہوں عالم کے حوادث اور تغیرات پر ان کا کوئی اثر نہیں پڑ سکتا، کائنات کا سارا نظام سعی و کوشش اور تعمیر و تزئین کی جد و جہد سے مطلقاً بیگانہ ہے۔ انسان نہ اپنی زندگی کو بنا سکتا ہے اور نہ بگاڑ سکتا ہے۔ ان صوفیانہ تصورات نے جو ذہن پیدا کیا اس میں ظاہر ہے انسانی افعال کے اثر و تاثیر کے لئے کوئی جگہ نہ تھی۔ عالم ایک وہم و خیال بن گیا۔ زندگی ایک بے حقیقت خواب ہو گئی اور ہنگامۂ وجود ایک لاینحل معمہ لیکن وحدت الوجودی صوفیوں کے دل میں بھی یہ سوال کھٹکتا رہا۔

جبکہ تجھ بن نہیں کوئی موجود — پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے

جدید تمدن کو اس پر ناز ہے کہ اس نے مرتبہ انسانیت کو پہچانا اور انسان کے صاحب اختیار ہونے کا مظاہرہ کیا۔ گذشتہ چند صدیوں میں جو غیر معمولی مادی میکانی اور سیاسی ترقی ہوئی ہے اس سے یہ بات واضح ہو گئی کہ انسان اپنی معاشرت سیاست اور معیشت کے سانچے خود بناتا ہے اور ان کی اصلاح کر کے حالات و واقعات پر قابو حاصل کر سکتا ہے۔ انسانی جد و جہد نے نہ صرف صحراؤں کو گلزار بنایا ہے پہاڑوں کو مسمار کر کے ان کے اندر سے مواصلات کا سلسلہ جاری کیا۔ ہوا پر قابو پا کر فضائے بسیط کو سیرگاہ عالم بنایا سمندروں کو شق کر کے ان میں آبدوزیں چلائیں بلکہ معاشرت اور تمدن کے طریقوں کو بھی بدل دیا، سیاسی نظامات کی تخریب و تعمیر کی اور علوم و فنون کے ایسے بے بہا خزانے دریافت کئے جنہوں نے انسانی تصورات کو یکلخت منقلب کر دیا۔ ان واقعات کا نتیجہ یہ ہے کہ اب انسان کو اپنی عظمت و مرتبت اور اپنے اختیار کا جتنا احساس پیدا ہو گیا ہے اتنا کبھی اور زمانہ میں ممکن نہ تھا۔ انسان کو اب ایک فعال اور موثر ہستی قرار دیا گیا ہے وہ محض ایک مجہول اور منفعل آلۂ کار نہیں بلکہ صاحب قدرت و اختیار وجود ہے غرضکہ مذہبی جبریت کے ردِ عمل کے طور پر جدید انسان میں اپنی عظمت اور قدرت کا ایک مبالغہ آمیز احساس پیدا ہو گیا ہے۔ اور خدا کی عظمت کا تصور دھندلا ہوتا جا رہا ہے۔ اس طرح کی افراط و تفریط سے اصل حقیقت پر پردہ پڑ گیا ہے اور ضرورت ہے کہ انسان اور خدا کے تعلق کو زیادہ وضاحت کے ساتھ پیش کیا جائے۔

جدید انسان نے اپنی قدرت اور طاقت کے زعم میں ایک بڑی زبردست حقیقت کی طرف سے بے پرواہی کی ہے اور وہ یہ کہ انسانی بے بسی کا دائرہ عالم خارجی نہیں بلکہ نفسانی اہواء و خواہشات ہیں۔ بے شک انسان نے صحراؤں کو گلزار کر دیا۔ پہاڑوں کو کاٹ کر ان کے اندر راستے بنائے بحر و بر اور ہوا پر قابو حاصل کیا لیکن وہ اپنی قومی عصبیتوں گروہی اغراض نسلی امتیازات اور مادی خواہشات کے مقابلہ میں آج بھی اتنا ہی بے بس ہے جتنا پہلے تھا۔ سائنس کی تمام طاقت اور تعلیم و تربیت کے تمام وسائل کے باوجود آج بھی وہ ادنیٰ مفادات اور معمولی منفعت کی خاطر حقیقی انسانی مفاد کو بلا تامل قربان کر دیتا ہے افراد کی تمام اخلاقی خرابیاں

قومی سطح پر آج بھی اسی طرح موجود ہیں جیسے قدیم دور میں۔ سیاست کے وہی اوچھے ہتھیار جو صدیوں سے زیر استعمال تھے آج بھی بین الاقوامی سیاسیات میں مستعمل ہیں۔ قوموں کی باہمی منافرت و عداوت آج بھی اسی طرح قائم ہے جس طرح زمانہ ماضی میں مذہبوں اور ملتوں کی داخلی زندگی میں بھی اوچھے جذبات اور کمینگی کا وہی عالم ہے جو ہمیشہ سے تھا۔ انسانی جدوجہد نے گذشتہ دو تین صدیوں میں جتنے تعمیری کام کئے ان سب کا وجود معرض خطر میں ہے۔ جمہوری اقدار کو سب سے پہلے اسی مغرب نے پامال کیا جہاں سے جمہوریت ابھری تھی۔ احترام آدمیت کو بھی اسی ہوسناکی اور جذبہ ملک گیری نے ختم کیا جو گذشتہ دو عالمگیر جنگوں کے زمانہ میں مہذب اقوام پر مسلط تھی۔ غرضیکہ انسان اپنی کوششوں سے عالم فطرت اور خارجی نظامات پر قابو حاصل کرنے کے باوجود ابھی تک اپنے نفس اور اس کی اوچھے خواہشات کے آگے بے بس ہے۔ اس میں شک نہیں کہ انسان اپنے نفس پر بھی خود ہی قابو حاصل کر سکتا ہے اور اپنے اوچھے اور رکیک جذبات و خواہشات کو بھی اعلےٰ روحانی امنگوں میں بدل سکتا ہے لیکن یہ سب کچھ خدا پرستی کے بغیر اور اس احساس کی عدم موجودگی میں ناممکن ہے کہ ایک طاقت ہم سے برتر ہے جس کو کسی نسل، کسی خاندان، کسی قوم، کسی مذہب کسی پارٹی اور کسی فرد کے ساتھ کوئی خصوصیت نہیں اور جس کے قوانین حیات اپنے اثر میں بالکل بے لاگ اور غیر جانبدار ہیں۔ انسان کی باطنی بے بسی دور ہو سکتی ہے تو وہ بھی اس عجز و احساس اور جذبہ عبودیت کے تحت اور اس کے تقاضوں کی تکمیل کرکے۔

انسان کے مرتبہ اور حیثیت کے تعین کے مسئلہ کو دو مختلف زاویوں سے دیکھا جا سکتا ہے ایک خالص فلسفیانہ نقطۂ نظر اور دوسرے دینی نقطۂ نظر سے۔ پہلے ہم اس مسئلہ پر غیر دینی حیثیت سے نظر ڈالتے ہیں اور پھر یہ بتائیں گے کہ اسلام نے مرتبہ انسانی کا کیا تصور پیش کیا ہے۔

فلسفیانہ نقطۂ نظر سے انسان اور خدا کے تعلق کا مسئلہ وحدت و کثرت کے باہمی ربط و علاقہ پر منحصر ہے۔ سوال یہ ہے کہ عالم انسانی کی کثرت مطلق ہے یا اضافی اور آیا کوئی وحدت اس کی شیرازہ بند ہے یا نہیں۔ کثرت ایک حقیقی تجربی واقعہ ہے، جس سے کوئی شخص انکار نہیں کر سکتا زندگی کی ساری ہماہمی کثرت پر موقوف ہے۔ اگر عالم صرف ایک وجود واحد سے عبارت ہوتا اور واقعات ہستی صرف اسی کے فعل و اثر کا نتیجہ ہوتے تو ایسی دنیا میں نہ کوئی کشمکش ہوتی۔ نہ پیکار و تصادم نہ مفادات و مقاصد کی آویزش۔ یہ ایک منجمد اور ساکن دنیا ہوتی جس میں کسی تعمیری جد و جہد اور ارتقائی حرکت کی گنجائش نہ ہوتی۔ عالم ہستی میں جو کشمکش، مسابقت اور تعمیری جوش نظر آتا ہے اس کے لئے کثرتِ نفوس اور مختلف حقیقی اناؤں (EGOS) کا وجود ضروری ہے۔ اگر کوئی انسانی انا حقیقی نہ ہوتا اگر اس کے اندر واقعات کو متاثر کرنے اور ا

کا رُخ بدلنے کی صلاحیت نہ ہوتی بالفاظ دیگر اگر افراد انسانی تعلیلی قوت (CAUSAL POWER) اور تاثیری فعل سے بالکل خالی ہوتے تو وہ شجر و حجر اور نباتات و جمادات کی طرح لگے بندھے قوانین کے مطابق کام کرتے رہتے اور ان کے اندر کوئی باہمی اختلاف و تصادم اور پیکار و مسابقت وجود میں نہ آتی۔ جمادات اور نباتات کی دنیا میں اناؤں کا وجود ہو سکتا ہے جیسا کہ لائبنز کے نظریہ مونادات میں فرض کیا گیا ہے۔ لیکن اگر اس عالم میں "انا" موجود ہیں تو بھی ان میں تاثیری قوت مفقود ہوگی۔ جماداتی "انا" اپنی ہستی کو برقرار رکھنے کی طاقت تو ضرور رکھتا ہے اور اس میں نفیاً ایک قسم کی مزاحمت بھی پائی جاتی ہے۔ لیکن یہ ایک سلبی قوت سے زیادہ نہیں وہ دوسری ہستیوں کے بالمقابل اپنا وجود قائم رکھنے کے لئے مزاحمت تو کرتا ہے لیکن اپنے انا کی توسیع اور اس کے اثبات (ASSERTION) کی کوئی قوت نہیں رکھتا۔

لیکن انسانی 'اناؤں' کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ محض سعی بقا کا جذبہ نہیں رکھتے بلکہ ایجاباً اثبات خودی (SELF ASSERTION) کے جذبہ سے معمور ہیں۔ وہ اپنی توسیع بھی چاہتے ہیں اور جب اس توسیع طلبی میں دوسرے انسانی انا ان کے مزاحم ہوتے ہیں (کیونکہ ہر انا اسی توسیع میں مصروف ہے) تو انہیں اپنا مطیع بنانے کمزور بنانے یا مٹا دینے میں بالکل دریغ نہیں کرتے۔ یہی وجہ ہے کہ جماداتی اور نباتی اناؤں کے باعث کوئی تصادم رونما نہیں ہوتا لیکن حیوانی اناؤں کی کثرت سے پیکار پیدا ہوتی ہے۔ اگر ہم یہ مان لیں کہ ان اناؤں میں کوئی تاثیری اور فعلی قوت نہیں اور جمادی اناؤں کی طرح یہ بھی ایک واحد قوت کے آلۂ کار ہیں تو انسان کی حیثیت مشین کی رہ جائے گی اور اس کے اختیار اور آزادی کا تصور باطل ہو جائے گا۔ اس لئے یہ ماننا پڑے گا کہ انسانی انا کی آزادی اور خود مختاری حقیقی ہے اور کوئی ایسی وحدت دنیا میں موجود نہیں جو ان اناؤں کو اپنے اندر اس طرح جذب کر لے جیسے دریا قطرہ کو یعنی ان کا وجودِ انفرادی ایک ہمہ گیر کلیت میں بالکل معدوم ہو جائے۔

لیکن سوال یہ ہے کہ کیا اناؤں کی اس کثرت میں کوئی تشکیلی وحدت کار فرما نہیں۔ کیا ہر انا انا نے مطلق ہے کیا اناؤں کی آزادی اور خود مختاری مطلق لامحدود اور غیر مقید ہے۔ ایک سطحی نظر کا آدمی بھی یہ محسوس کر سکتا ہے کہ کوئی انا نے حیوانی دوسرے اناؤں کے تعاون کے بغیر نہ تو زندہ رہ سکتا ہے اور نہ اپنی توسیع ذات کی جدوجہد میں کامیابی حاصل کر سکتا ہے۔ کوئی فرد اپنی آرزوؤں اور نصب العین کی تکمیل میں دوسرے افراد کی ضروریات و احساسات کو یکسر نظر انداز نہیں کر سکتا۔ کوئی قوم دوسری قوموں سے تعاون حاصل کئے بغیر اپنے سیاسی عزائم کی تکمیل نہیں کر سکتی۔ کوئی فوج تنظیم اور قیادت کے بغیر جنگ نہیں کر سکتی، کوئی جماعت لیڈر شپ اور نظم و ضبط کے بغیر اپنے مقاصد میں کامیاب نہیں ہو سکتی۔ قومیں محض افراد کے مجموعہ کا نام نہیں۔ جماعتیں خالی اجتماع نفوس سے وجود میں نہیں آئیں۔ خاندان اور قبائل صرف چند بندھوں

نوجوانوں اور بچوں کے بے وضع اور نامربوط انبوہ کا نام نہیں، کوئی عدد محض دوسرے اعداد کو جمع کرنے سے نہیں بنتا ۵ + ۴ + ۱ = ۱۰ کا مطلب یہ نہیں ہو سکتا کہ دس کا عدد اپنی کوئی مستقل ہستی نہیں رکھتا۔ غرضکہ زندگی کی کثرت میں وحدت کا ایک تقاضا پوشیدہ ہے اور کسی وحدت آفرین قوت (UNIFYING FORCE) کے بغیر نہ افراد کی جدوجہد کا کوئی نتیجہ برآمد ہو سکتا ہے اور نہ جماعتوں اور قوموں کی کشمکش کا۔ اداروں کی کثرت کا قیام بھی ان کی وحدت میں مضمر ہے اور یہی وجہ ہے کہ دنیا میں تنظیم کے بغیر کوئی بڑا یا چھوٹا کام پایۂ تکمیل کو نہیں پہنچتا، کیونکہ تنظیم وحدت ہی کا دوسرا نام ہے۔ یہی وحدت افراد اور اداروں کی شیرازہ بند ہے۔ اس کے بغیر ان کے اندر کوئی فاعلانہ قوت نہیں پیدا ہو سکتی۔ لیکن یہ وحدت پیدا اسی وقت ہوتی ہے جب افراد اور اداروں میں اپنی مطلق العنانی اور کامل خود مختاری کا احساس زائل ہو جائے اور وہ کسی واحد تصور، واحد مقصد اور مشترکہ نصب العین کی خاطر اپنی آزادی سے کاملاً نہ سہی جزوی طور پر دستبردار ہو جائیں۔ شعوری یا غیر شعوری طور پر ہر 'انا' کو اپنی آزادی اور خود مختاری کی تحدید کرنی ہوتی ہے۔ اور کسی وحدت آفرین قوت کا مطیع بننا پڑتا ہے۔ پھر جس طرح عالم کے مختلف اجزاء اور اکائیوں میں ایک نظم آفرین وحدت موجود ہے۔ اسی طرح کل کائنات کی بھی ایک نظم آفرین وحدت کا موجود ہونا ضروری ہے۔ ورنہ ان مختلف اجزاء اور اکائیوں کے تصادم سے عالم پاش پاش ہو جائے۔ اسی نظم آفرین توحیدی قوت کو مذہبی اصطلاح میں خدا کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے اب یہ ظاہر ہے کہ اس وحدت کے لئے کثرت کا موجود ہونا ضروری ہے، ورنہ وحدت کس کثرت کی شیرازہ بند ہو گی، وحدتِ مطلقہ، جو کثرت کو بالکل معدوم کر دے اپنی آپ نفی ہے اور جو کثرت وحدت کی تابع نہ ہو جس کے اندر کوئی نظم آفرین توحیدی قوت کارفرما نہ ہو اس کا وجود ایک لمحہ بھی قائم نہیں رہ سکتا، عبادت کے لئے معبود اور عابد کا وجود یکساں ضروری ہے، عابد کو بے حقیقت قرار دیا جائے تو معبود کا تصور بھی باطل ہو جاتا ہے۔ غرضکہ خدا اور انسان باہم لازم و ملزوم ہیں اور انسان کی بے حقیقتی کا خیال درحقیقت خدا کی توہین ہے۔ کیونکہ خدا کی تخلیق بے حقیقت نہیں ہو سکتی۔ اگر کائنات اور اس کی کثرت محض ایک فریب ہے جیسا کہ وحدت الوجودی صوفیا کا خیال ہے تو اس سے خدا کی خدائی پر حرف آتا ہے، لیکن یہ بھی ظاہر ہے کہ انسان کے شرف و امتیاز اس کی عظمت و کامرانی اور اس کی تسخیری صلاحیتوں کے کامیاب استعمال کی شرط یہ ہے کہ وہ اس وحدت آفرین اور نظم آفرین قوت کے ساتھ صحیح رابطہ پیدا کرے جو عالم میں سرگرم کار ہے۔

اس طرح انسان کی مطلق آزادی اور اختیار کا خیال بھی بے حقیقت اور اس کی کامل بیچارگی اور بے بسی کا تصور بھی یکساں طور پر ناقص ہے۔ انسان کی آزادی اور اختیار کے معنی یہ نہیں کہ وہ اپنی آرزوؤں اور تمناؤں

کے حصول میں کسی قانون کسی مجبوری اور تحدید کا پابند نہیں۔ بلکہ اس کی آزادی قطعاً محدود اور مقید ہے۔ کوئی فرد اپنی طبعی مجبوریوں اپنی فطرتی صلاحیتوں اپنے خاندانی ماحول اپنی قومی روایات اور ماضی کے ورثے سے بالکلیہ آزاد ہو کر کام نہیں کر سکتا۔ اس کا جو قدم اٹھے گا وہ ان حدود کے اندر محصور ہوگا۔ خود ہمارا جمادی اور نباتی ماحول بھی ہماری زندگی پر پابندیاں عاید کرتا ہے۔ ہم مادی مزاحمتوں سے مقابلہ کرنے میں مکان و زمان کے قیود اور مادہ کے قوانین حرکت سے منہ نہیں موڑ سکتے۔ ہم اپنے جغرافی اور طبعی ماحول سے بھی ایک حد تک مجبور ہیں افراد کی طرح جماعتیں اور قومیں بھی اپنی زبردست اجتماعی قوت کے باوجود زمان و مکان کے قیود کی پابند ہیں، جو جماعت یا قوم زندگی کی راہ میں آگے بڑھنا چاہے یا اپنی معاشرتی اور تمدنی اصلاح کے لئے کوشاں ہو اس کے لئے ممکن نہیں کہ وہ اپنے گرد و پیش ماحول۔ تاریخی روایات، قومی مزاج اور اپنے مرحلہ ارتقاء کی ضروریات سے آنکھیں بند کر کے کام شروع کر دے۔ اس کا نقطۂ آغاز وہی ہوگا جہاں اس کی سابقہ تاریخ نے اُسے لا کر چھوڑا ہے، ایک پسماندہ قوم یکدم ترقی یافتہ قوموں کے معیاراتِ عمل اور فکر کے مطابق کام نہیں کر سکتی۔ وہ صرف مادی وسائل کے اعتبار سے ہی مجبور نہیں ہوتی بلکہ قومی تصورات و افکار روایات تاریخ، تمدن اوضاع و اطوار کے ایک ایسے حلقہ میں پھنسی ہوتی ہے جس سے آگے بڑھنے میں وقت اور محنت و کوشش درکار ہوتی ہے۔ پھر جس طرح مادی قوانین انسان کی آزادی عمل کو محدود کرتے ہیں اسی طرح وہ اخلاقی تمدنی اور سماجی قوانین کا بھی پابند ہے۔ مادیات کا دائرہ ہو یا روحانیات اخلاقیات اور سماجیات کا کہیں بھی انسان قوانین حیات کی گرفت سے آزاد ہو کر کام نہیں کر سکتا، یہ قوانین کہاں سے آتے ہیں۔ ان کے ذریعہ کون سی طاقت ہمارے دائرۂ عمل اور دائرۂ اختیار کو محدود کرتی ہے۔ اس سوال پر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ اسی نظم آفرین توحیدی قوت کی پیداوار ہیں جو عالم میں سرگرم کار اور زندگی کو محیط ہے۔ ان قوانین کا وجود بتا رہا ہے کہ زندگی اپنی رفتار میں بے ضبط و بے آئین نہیں بلکہ اس کی فطرت میں ضبط شناسی، آئین پسندی اور وحدت آفرینی پنہاں ہے اس وحدت آفرینی سے آنکھیں بند کر لینا اور ان قوانین کی نگہبانی سے منہ موڑ لینا جن کے ذریعہ عالم کی توحیدی قوت اس انتشار میں نظم اور اس کثرت میں ہم آہنگی پیدا کرتی ہے ناکامی اور نامرادی کو دعوت دینا ہے۔

اختلافات عالم کے ساتھ ساتھ اس کی یکسانی اور ہم آہنگی اور کثرت کے ساتھ وحدت کا موجود ہونا ایک ایسی حقیقت ہے جس کا مظاہرہ ہر شعبۂ حیات میں ہوتا رہتا ہے۔ اور ان دو گونہ عوامل کی یکساں اہمیت کا ہر گوشۂ زندگی میں مشاہدہ کیا جا سکتا ہے۔ افراد انسانی کے اختلافات کا کون انکار کر سکتا ہے۔ دنیا میں کوئی دو انسان ایک جیسے نہیں بن سکتے کیونکہ فطرت میں تکرار نہیں۔ طبائع اور جذبات کا فرق صلاحیتوں اور میلانات کا اختلاف صنف بشری کا ایک لازمی خاصہ ہے۔ اگر کوئی شخص اس مفروضہ پر عمل کرنا شروع کر دے کہ تمام انسان جملہ اعتبارات سے یکساں ہیں

تو ایسا آدمی سوسائٹی میں بالکل کامیاب نہیں ہو سکتا۔ ہمیں لوگوں کے انفرادی ذوق طبائع اور صلاحیتوں کی رعایت کرنی پڑتی ہے تب ہم کسی اجتماعی مہم میں کامیابی حاصل کرتے ہیں۔ سوسائٹی کی اجتماعی طاقت کا راز بھی اسی بات میں مضمر ہے کہ لوگوں کو ان کی مختلف صلاحیتوں اور میلانات کے مطابق کام کرنے کا موقع مل جائے۔ اور انہیں کسی ایسے آہنی شکنجہ میں نہ کسا جائے جس سے ان کی انفرادیت اور تشخص یکسر زائل ہو جائے۔ ما فراد انسانی کی قدر و قیمت کا تعین ان خصوصیات سے کیا جاتا ہے جن میں وہ دوسروں سے ممتاز مافوق اور یکتا ہوتے ہیں جو خصوصیات و اوصاف سب انسانوں میں مشترک ہوں ان کی بنا پر ہم کسی شخص کی قدر و قیمت کا تعین نہیں کر سکتے اور یہ بات صرف انسانوں تک محدود نہیں، مادی اشیا کا بھی یہی حال ہے، ہر چیز اس خصوصی مقصد کے لئے مطلوب ہوتی ہے جس کے پورا کرنے کی اس میں امتیازی صلاحیت ہو۔ پتھر کا فائدہ یہ ہے کہ اس سے مکان کی مضبوطی ہوتی ہے۔ اس لئے مکان کی تعمیر کے لئے ہم ہمیشہ اسی کا استعمال کرتے ہیں کیونکہ یہ غرض کسی اور مادی شئے سے پوری نہیں ہو سکتی۔ یہی حال غذاؤں کا ہے کہ ہر غذا اپنی تاثیر اور خواص کے لحاظ سے مختلف ہوتی ہے انسان کو اپنی جسمانی خصوصیات کے لحاظ سے جس قسم کی غذا مطلوب ہو اگر اسکا استعمال نہ کیا جائے تو صحت پر برا اثر پڑتا ہے۔۔ کپڑا اس لئے مفید سمجھا جاتا ہے کہ اس سے جسم کی حفاظت ہوتی ہے۔ اگر یہ مقصد کسی اور مادی شئے کے ذریعے حاصل ہو سکتا تو کپڑے کی افادیت زائل ہو جاتی۔ سونا جو کام دیتا ہے وہ فولاد سے نہیں لیا جا سکتا، فولاد کا جن اغراض کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ ان کی تکمیل کسی اور شئے سے نہیں ہو سکتی۔ غرضیکہ مادی اشیا ہوں یا افراد بشری ان کی افادیت ان خصوصیات سے وابستہ نہیں جن میں وہ دوسروں کے ساتھ اشتراک رکھتے ہیں۔ بلکہ ان کی قدر و قیمت ان امتیازی اوصاف میں مضمر ہوتی ہے۔ جن میں وہ منفرد اور یکہ و تنہا ہوں۔ اس نقطۂ نظر سے کثرت کا وجود نہایت حقیقی نہایت اہم اور کاروبار زندگی کے لئے نہایت ضروری ہے۔ اور کوئی ایسا نظریۂ حیات جو اشیاء اور اجسام ذی حیات کے اختلاف تنوع کثرت اور انفرادیت کا منکر ہو عملی زندگی کے لئے بالکل بے کار ہے لیکن کیا اس دائرہ میں بھی وحدت سے گریز ممکن ہو سکتا ہے۔ کیا مادی اشیاء کے استعمال میں ہم قانون جذب و کشش قانون حرکت اور قانون جمود (LAW OF INERTIA) کو نظر انداز کر سکتے ہیں اور کیا انسانوں سے معاملہ کرنے میں قوانین نفسیات سے پہلو تہی ممکن ہے۔ اشیائے مادی خواہ ان کی انفرادی خصوصیات کچھ بھی ہوں سب کی سب طبعی قوانین کے زیر فرمان ہیں اور جب تک ان قوانین کا علم نہ ہو کسی شئے کا استعمال صحیح طور پر نہیں کیا جا سکتا۔ کوئی انجینیئر جس کے ذمہ تعمیر اکنہ کا کام ہو اس وحدت و یکسانیت کو فراموش نہیں کر سکتا۔ جس پر فن انجینیری کے قوانین مبنی ہیں اگر وہ اس مفروضہ پر کام شروع کرے کہ ہر مکان کی زمین باعتبار خصوصیات مختلف ہوگی، ہر پتھر اینٹ اور شہتیر کا انداز کار (BEHAVIOUR) جدا ہوگا اور ہر عمارت کی تعمیر میں ایسے نئے اصولوں اور قوانین کے

مطابق کام کرنا پڑے گا تو وہ ایک دن بھی اپنے پیشہ کے فرائض سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتا۔ کوئی ڈاکٹر صحت کے عام قوانین کا علم حاصل کئے بغیر محض افراد کی امتیازی جسمانی خصوصیات کے مطالعہ سے علاج و معالجہ نہیں کر سکتا۔ اعضائے جسمانی کے وظائف کا ایک عام علم ہے جس میں ہر ہر جسم کی جداگانہ خصوصیات کا لحاظ نہیں کیا جاتا، لیکن پھر بھی اس علم کے قوانین ہر فرد کی جسمانی زندگی پر منطبق ہوتے ہیں اور انہیں قوانین پر سارے علم طب کا دارومدار ہے۔ اگر انسان کے جسمانی افعال اور اعضائے کے وظائف میں کوئی وحدت و یکسانیت نہ ہو تو ساری فزیالوجی (علم تشریح الاعضاء) بیکار ہو جائے۔ ماڈیات کی مانند روحانیات، اخلاقیات اور سماجیات میں بھی عمومی قوانین کے بغیر کوئی کام نہیں ہو سکتا۔ اگر کسی ملک کے قانونی نظام میں افراد کی ذاتی خصوصیات و حالات اور ان کے انفرادی طبائع کی رعایت کی جائے تو تشکیل قانون اور نفاذ قانون یکساں محال ہو جائے۔ چوری کے انسداد کے لئے ہر سرقہ کی خصوصی نوعیت کا لحاظ نہیں کیا جا سکتا۔ رشوت ستانی کو روکنے کے لئے ہر رشوت خوار کے حالات و نفسیات کی رعایت نہیں کی جا سکتی، جعل و فریب اور دیگر جرائم کی روک تھام میں بھی قانون صرف عام نفسیاتی اصولوں کا لحاظ کر سکتا ہے اور فطرتِ انسانی کی عام خصوصیات پر اپنے ضوابط کی بنیاد رکھتا ہے۔ کسی مملکت کا نظم و نسق بھی ان عام حالات کی رعایت کرتا ہے جو اس میں پائے جاتے ہیں اور انعام و سزا، تحریص و تخویف، جبر و قوت اور افہام و تفہیم کے عام انسانی محرکات سے کام لیتا ہے۔ اسی طرح مختلف ممالک اپنے لئے جو سیاسی دستور وضع کرتے ہیں ان میں صرف عام حالات اور بنیادی مسائل سے تعرض کیا جاتا ہے اور انسانی فطرت کی عمومی خصوصیات کے مدِ نظر توازنات اور تحدیدات (CHECKS AND BALANCES) کا ایک نظام قائم کیا جاتا ہے۔ یہی حال ملک کے معاشی اور معاشرتی نظامات کا بھی ہے جن سیاسی، ملکی اور معاشی نظامات میں خصوصی طبقات کے ساتھ امتیازات و مراعات روا رکھے جاتے ہیں ان کو ہم غیر عادلانہ قرار دیتے ہیں اور تاریخ بتاتی ہے کہ ایسے نظام بالکل ناپائیدار ثابت ہوتے ہیں۔ کیونکہ ان میں انسانی فطرت کے مشترک محرکات۔ داعیات اور ہر فردِ انسانی کے یکساں جذبات و خواہشات اور حقوق کا لحاظ نہیں کیا جاتا۔ اس کے برعکس اس نظامِ زندگی کو ہم عدل و رحم پر مبنی سمجھتے ہیں۔ جس میں تمام انسانوں کے ساتھ یکسانیت اور مساوات کا برتاؤ کیا جائے اور جس کی پشت پر یہ عام تصور ہو کہ تمام انسان اصلاً ایک ہیں بنیادی خصوصیات کے لحاظ سے انسانوں کے درمیان تفریق نہیں کی جا سکتی، ہر فرد کو ترقی نشو و نما اور اپنی مخصوص صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کا یکساں حق حاصل ہے اور حکومت و اقتدار اور مال و دولت کا کوئی اجارہ دار نہیں۔ غرضکہ قانون، دستور، نظم و نسق اور معاشرتی عدل سب کی تہ میں وحدت و یکسانیت اور کلی اور عمومی تصورات کے اصول کارفرما ہوتے ہیں اور جس سوسائٹی میں وحدت، یکسانیت اور عمومیت و کلیت کے اصولوں کا فقدان ہو اسی نسبت سے وہ سوسائٹی حقیقت و صداقت سے بعید اور نظم و استواری میں کمزور ہو گی، جن تصورات کو ہم قانون، عدل

اور صداقت کے ناموں سے موسوم کرتے ہیں۔ وہ بھی در اصل وحدت کی مختلف شکلیں ہیں۔ قانون وہی قانون ہے جو سب کے لئے یکساں ہو۔ عدل اور انصاف کے معنے بھی یہ ہیں کہ افراد، خاندانوں، طبقوں اور قوموں کے ساتھ کوئی امتیازی تعلق اور خصوصی رو رعایت روا نہ رکھی جائے۔ صداقت وہی ہے جو ہر شخص کے لئے قابل قبول ہو سکے اور جس کا اطلاق ہر اضافی حقیقت اور تمام منفرد واقعات پر کیا جا سکے۔ غرضکہ ہر شعبہ میں ہم وحدت کی مدد سے کثرت پر قابو پاتے ہیں۔ بے شمار منفرد واقعات کے مشاہدہ سے کلی تصورات اخذ کئے جاتے ہیں اور پھر ان تصورات کے ذریعہ واقعات کو گرفت میں لایا جاتا ہے۔ سائنس روزمرہ کے مشاہدہ سے قوانین طبعی کا انکشاف کرتی ہے اور پھر ان قوانین کے ذریعہ مادی اشیاء پر دسترس حاصل کرتی ہے ہتھنی اور دستور ساز عام حالات و طبائع۔ انسانی فطرت کی کمزوریوں اور سیاسی جوڑ توڑ کے مروجہ طریقوں کے مشاہدہ سے کچھ کلیات قائم کرتے ہیں اور پھر ان کلیات کے ذریعہ سیاسی اور اخلاقی زندگی کے انضباط کا راستہ نکال لیتے ہیں۔ اگر انسان صرف مجرد اور منفرد احساسات کا نام ہو اور اس میں تعقل اور کلیات سازی کا ملکہ نہ ہو بالفاظ دیگر اگر وہ کثرت کے اندر وحدت تلاش کرنے کی صفت سے عاری ہو تو وہ بہائم سے کسی طرح ممتاز نہیں ہو سکتا۔ انسان کو جو چیز انسان بناتی ہے وہ اس کی الٰہی صفات ہیں وہ اس کی فطرت میں اعلیٰ نصب العین کی تلاش کا جذبہ اور کثرت سے بلند ہو کر وحدت سازی کا داعیہ ہے۔ خدا کی طلب اس کی رگ و پے میں پیوست ہے اس طلب سے اسے کوئی مفر نہیں، وہ اپنی تکمیل کے لئے ایک محیط اور ہمہ گیر وحدت کا طالب ہے، جس کے معنے یہ ہیں کہ انسان کے لئے خدا کا تصور اور خدا کی پرستش اتنی ہی ضروری ہے جتنی اس کی جسمانی غذا۔

گزشتہ بحث سے یہ بات ثابت ہو گئی کہ کثرت اور وحدت دونوں کا وجود حقیقی ہے اور کائنات میں ایسی کوئی وحدت نہیں جو انسانی انا کو اپنے اندر اس طرح جذب کر لے کہ اس کا وجود، انفرادی خصوصیات ذاتی اور اس کی آزادی اور اختیار مطلقاً فنا ہو جائیں لیکن اس کے یہ معنے نہیں کہ انائے انسانی مطلقاً آزاد، لامحدود اور اپنی خصوصیات میں اتنا منفرد ہے کہ اس کو کسی وحدت کی گرفت میں نہیں لایا جا سکتا۔ ہر انسان ایک لحاظ سے یکتا ہے۔ اس کی خصوصیات اس کے ملکات اور میلانات دوسروں سے جدا ہیں۔ اور اس اعتبار سے وہ دوسروں سے ایک حد تک بے نیاز اور ایک ہستی مختار ہے۔ لیکن ایک دوسرے نقطۂ نظر سے وہ دیگر ہستیوں کا محتاج اور ان کی مشترک زندگی کا شریک ہے۔ اپنی اثبات ذات اور توسیع حیات کے لئے وہ دوسروں کے ساتھ تعاون کرنے اور ان کے احساسات و تخیلات میں شریک ہونے پر مجبور ہے۔ یہیں سے اس کی پابندیوں کے حدود شروع ہوتے ہیں۔ پھر جس طرح عالم خارجی پر قابو حاصل کرنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ کلی تصورات و افکار اور وحدت قوانین عالم کا معرفت شناس ہو اسی طرح معاشرتی، سیاسی اور تمدنی زندگی میں بھی اس کی کامیابی اس پر منحصر ہے کہ وہ وسیع سے وسیع تر وحدت کا متلاشی اور ایسے ادارے قوانین اور نظامات بنانے پر قادر ہو جو زیادہ سے زیادہ انسانی

کے مقاصد، آرزوؤں اور نصب العینوں کے جامع ہوں۔ مختصراً وہ کثرت سے بلند ہو کر وحدت کی طرف ترقی کرے انتشار کی جگہ نظم پیدا کرے، فساد کی بجائے اصلاح کرے اور تخریب کی جگہ تعمیر کا خوگر ہو، کیونکہ ہر انتشار ہر فساد اور ہر تخریب در حقیقت وحدت کی نفی ہے۔ اس لئے وحدت ہی اس کے فوز و فلاح کی ضامن ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ گو کثرت حقیقی ہے لیکن وحدت زیادہ حقیقی ہے۔ گو انسان فاعل و مختار اور آزاد ہے لیکن خدا زیادہ فاعل زیادہ مختار اور زیادہ قادر و توانا ہے۔ کیونکہ وہی کثرتِ عالم کا شیرازہ بند ہے اور اس کے بغیر یہ کثرت آپس کے تصادم اور تضاد سے پاش پاش ہو جائے گی لو کان فیھما آلھۃ الا اللہ لفسدتا (اگر اللہ کے سوا زمین اور آسمان میں کوئی اور خدا ہوتا تو ان میں فساد پیدا ہو جاتا) انسان اپنی تمام طاقت اور اختیار حقیقی کے باوجود انسان ہی رہے گا۔ خدا نہیں بن سکتا۔ الوہیت انسانی سے انکار کے معنے یہی تھے۔ یہ مطلب نہ تھا کہ انسان اختیار و آزادی کی نعمت سے بالکل محروم اور ایک بے بس اور غیر فعال ہستی ہے۔ اب ہم دینی اور اسلامی نقطۂ نظر سے اس مسئلہ پر روشنی ڈالیں گے (باقی آئندہ)

حکمتِ رومی
مصنفہ ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم
قیمت تین روپے

اسلام میں حیثیت نسواں
مصنفہ محمد مظہر الدین صدیقی صاحب
قیمت تین روپے

تہذیب و تمدن اسلامی
مصنفہ مولانا رشید اختر ندوی
قیمت حصہ اوّل پانچ روپے، دوم چھ روپے، سوم پانچ روپے بارہ آنے

طب العرب
مترجمہ سید علی احمد صاحب نیر واسطی
قیمت چھ روپے

بیدل
مصنفہ خواجہ عباداللہ اختر
قیمت پانچ روپے

افکار ابن خلدون
مولانا محمد حنیف ندوی
قیمت تین روپے

ملنے کا پتہ:- **ادارہ ثقافت اسلامیہ۔ کلب روڈ۔ لاہور**